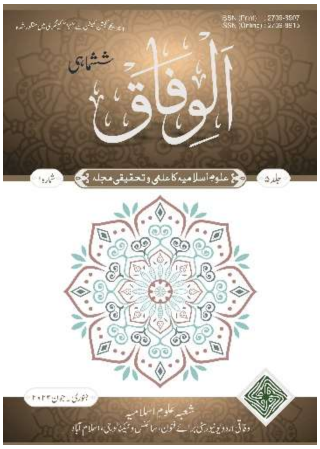

Al-Wifaq Research Journal of Islamic Studies
Volume 5, Issue 1 (January - June 2022)
eISSN: 2709-8915, pISSN: 2709-8907
Journal DOI: https://doi.org/10.55603/alwifaq
Issue Doi: https://doi.org/10.55603/alwifaq.v5i1
Home Page: https://alwifaqjournal.com/
Journal QR Code:

Indexing

Article	انسانی تہذیبوں میں سماجی اخلاقیات کا تصور: اسلامی تعلیمات کی روشنی میں The Concept of Social Ethics in Human Civilizations: In the light of Islamic Teachings
Authors	Syed Iftikhar Ali Gillani[1] Dr. Fayyaz Ahmad Farooq[2]
Affiliations	[1] Senior Lecture, Department of Islamic Studies, Institute of Southern Punjab, Multan. [2] Assistant Professor, Department of Islamic Studies, Institute of Southern Punjab, Multan.
Published	30 June 2022
Article DOI	https://doi.org/10.55603/alwifaq.v5i1.u3
QR Code	
Citation	Iftikhar Ali Gillani, Syed, and Fayyaz Ahmad Farooq, Dr, " *The Concept of Social Ethics in Human Civilizations: In the light of Islamic Teachings"* Al-Wifaq, 2022, vol.5, No.1, 35–63
Copyright Information:	انسانی تہذیبوں میں سماجی اخلاقیات کا تصور: اسلامی تعلیمات کی روشنی میں The Concept of Social Ethics in Human Civilizations: In the light of Islamic Teachings © 2022 by Syed Iftikhar Ali Gillani, and Dr. Fayyaz Ahmad Farooq is licensed under CC BY 4.0
Publisher Information:	Department of Islamic Studies, Federal Urdu University of Arts Science & Technology, Islamabad, Pakistan.

انسانی تہذیبوں میں سماجی اخلاقیات کا تصور: اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

The Concept of Social Ethics in Human Civilizations: In the light of Islamic Teachings

*سید افتخار علی گیلانی

** ڈاکٹر فیاض احمد فاروق

ABSTRACT:

Civilization depicts the manners of life, sense, and thought of any society. Hence ways of living, social relations, ethics, habits, norms, and customs are phenomena of civilization. As human civilized life is concerned, civilization is the reflection of human personality, character thus ethics occupied a dignified status in the fulfillment of human character. From the study of human social life, we come to know that good character, noble personality, implementation of duties, responsibilities, and social safety is necessary for better ways of life. Ethics is considered the fundamental base of all these items. Thus, it was necessary to highlight the concept of social ethics after studying all human civilizations. In this article, the concept of social ethics is explained after defining the meaning of ethics. Besides it, social ethical rules and relations are described; the concept of marriage is prominent among the social ethical shortcomings. Islamic civilization and social ethics are explained in the end.

KEYWORDS:

definition of ethics, social ethical norms, social ethical relations, social ethical shortcomings.

تعارف

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر عزت و توقیر سے نوازا اور پھر اس کو زمین پر اتارا تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی منظم زندگی بھی بسر کرے۔ انسانی فطرت میں یہ بات بھی ودیعت کر دی گئی کہ اس کے لیے تنہا زندگی گزارنا مشکل امر ہے، اس لیے وہ باہم مل جل کر زندگی بسر کریں اور جب مختلف لوگوں نے مل جل کر رہنا شروع کیا تو یہیں سے انسان کی معاشرتی زندگی کا بھی آغاز ہوا۔ انسان نے معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے مختلف

* سینئر لیکچرر، شعبہ علوم اسلامیہ، انسٹی ٹیوٹ آف سدرن پنجاب، ملتان

** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، انسٹی ٹیوٹ آف سدرن پنجاب، ملتان

مہارتوں کا استعمال کیا اور ایسے اصول وضوابط بنائے جس سے انسان کی معاشرتی زندگی میں نکھار پیدا ہوا اور یہیں سے اس کی معاشرتی زندگی میں تہذیبی شعور کا بھی آغاز ہوا۔ اس کے بعد انسانی زندگی تہذیب وتمدن کا گہوارہ بنتی چلی گئی۔

تہذیب کسی بھی معاشرے کی طرز زندگی اور فکر و احساس کی آئینہ دار ہوتی ہے، چنانچہ رہن سہن، سماجی رشتے، اخلاق و عادات، رسوم و رواج اور خاندانی تعلقات سب تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔ اگر تہذیب کو وسیع معانی میں دیکھیں تو یہ وہ معاشرتی ترتیب ہے جو ثقافتی تخلیق کو فروغ دیتی ہے، جس سے انسانی زندگی نکھر کر سامنے آتی ہے۔ جہاں تک انسانی زندگی کا تعلق ہے تو اس کی بنیاد پانچ چیزوں پر استوار ہوتی ہے، جس میں قابل ذکر معاشرتی زندگی، معاشی استحکام، سیاسی تنظیم، اخلاقی روایات اور علم و فن کی جستجو وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب میں معاشرتی زندگی بہت اہم ہے کیونکہ طرز حیات سے کسی بھی انسانی زندگی کی پہچان ہوتی ہے اور اسی پہچان کو تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔

جہاں تک انسان کی تہذیبی زندگی کا تعلق ہے تو تہذیب ہی انسانی شخصیت و کردار کی عکاس ہوتی ہے۔ انسانی زندگی بہت سے افعال و اعمال کا مجموعہ ہوتی ہے اور انہیں افعال و اعمال سے انسان کی متمدن زندگی کا تصور ملتا ہے۔ افعال میں حسن خلق سب سے اہم عنصر تصور کیا جاتا ہے کیونکہ اخلاق ہی انسانی کردار کی تکمیل میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اخلاق ہی وہ اساسی رویہ ہے جس سے شخصیت انسانی کی نشوونما ہوتی ہے، انسانی طرز زندگی بھی اسی سے منعکس ہوتی ہے اور اس کی سنہری کرنیں انسان کی معاشرتی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ گویا اخلاق ایک ایسے علم کا نام بھی ہے جو انسان کے کردار و افعال، طرز حیات اور شخصیت سازی میں نکھار پیدا کرتا ہے اور اسی سے انسان کی سماجی زندگی کی تعمیر و توقیر ہوتی ہے۔ انسان کی سماجی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے طرز زندگی میں اچھے کردار، بہترین شخصیت، حقوق و فرائض کی ادائیگی، سماجی تحفظ کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے اور ان سب کی بنیادی اساس جس کو تسلیم کیا جاتا ہے اس کو اخلاقیات کا نام دیا جاتا ہے۔ گویا اخلاق ایک جامع تصور کا نام ہے جو پوری انسانی زندگی کے ہر پہلو کو محیط ہے۔

انسان معاشرت پسند ہے، اس کی سب سے بڑی دلیل موجودہ اور قدیم انسانی معاشرے میں تہذیب کی رعنایاں اور تمدن کی جوفشانیاں ہیں۔ انسان کی معاشرت پسندی نے انسانی اجتماعیت کو جنم دیا اور یہ چھوٹی سی خاندانی تنظیم بڑھ کر معاشرتی زندگی کو تشکیل دینے میں کامیاب ہوئی۔ انسان کی طویل اجتماعی زندگی میں بے شمار اجتماعی نظام معرض وجود میں آئے اور لاتعداد قومیں آباد ہوتی رہیں، لیکن تمام اقوام اور ان کے نظام ہائے معاشرت اپنی اصلی بنیادوں پر قائم نہ رہ سکے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا [1]

"اور نوح کے بعد ہم نے کتنی بستیاں ہلاک کر دیں اور آپ کا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں پر خبیر و بصیر ہونے کے لیے کافی ہے"۔

انسان کی تہذیبی داستان اور تمدنی سفر میں جن اقوام کو سربلندی حاصل رہی ہے ان میں یونانی، رومی، مصری، ایرانی اور ہندی نمایاں ہیں۔ گو ابتدائی معاشرت کے نمونے اب بھی دنیا کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں لیکن جن اقوام نے اپنے اجتماعی نظام قائم کیے ان کے نام تاریخ میں محفوظ رہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ان قدیم تہذیبوں کے سماجی نظام اور ان کے رہن سہن کا جائزہ لیا جائے کہ وہ کس حد تک متمدن تھے اور ان کی سماجی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ کیسے روابط تھے۔ ان کی سماجی زندگی میں اخلاقیات کا کیا تصور تھا، کیونکہ اخلاق ایک ایسی صفت ہے جس سے قوموں کی تمدنی زندگی کی حقیقی رعنائیوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس تحقیقی آرٹیکل میں قدیم انسانی تہذیبوں میں بھی اسی سماجی اخلاقیات کا جائزہ لیا جائے گا۔

انسانی تہذیبوں کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ پہلے اخلاق کے تصور کی وضاحت کر لی جائے کہ اخلاق سے کیا مراد ہے اور اس صفت کا انسانی زندگی سے کیا تعلق ہے۔

اخلاق کا معنی و مفہوم

جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے تو اخلاق خلق کی جمع ہے جس کے معنی اچھی عادات، تہذیب انسانیت، ملنساری، مروت کے ہیں، یعنی وہ علم جس میں تہذیب نفس اور معاشرتی معاملات کے اصولوں سے بحث کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تہذیب میں اچھے طور طریقوں کا اختیار کرنا، اس کے مطابق زندگی گزارنا اور عام معاشرتی معاملات کو اس کے مطابق ڈھالنا وغیرہ شامل ہے۔ سماجی زندگی میں ایسا طریقہ وضع کرنا جو اسے دوسرے تمام انسانوں سے بھی ممتاز کر دے۔ امام غزالی نے احیاء علوم الدین میں خلق کی بڑی عمدہ تعریف کی ہے وہ فرماتے ہیں:

> "خلق نفس کی اس ہیت راسخہ کا نام ہے جس سے تمام افعال بلا تکلیف صادر ہوں اگر یہ افعال عقلاً اور شرعاً عمدہ اور قابل تعریف ہوں تو اس ہیت کو خلق نیک، اگر برے اور قابل مذمت ہوں تو اس ہیت کو خلق بد کہتے ہیں۔"[2]

یہ فکری سوچ جب ارتقاء کرتے ہوئے ان کے مابعد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک پہنچی تو انہوں نے اخلاق کی تعریف ان الفاظ میں کی:

> "خلق انسان کی اس کیفیت کا نام ہے جو اس کی طبیعت کے مختلف اوصاف کی جدوجہد کر کے اپنی جانب راجع کرے"۔[3]

گویا خلق نام ہے انسان سے سرزد ہونے والے افعال و اعمال میں کسی خاص خوبی یا وصف کا، اور ایسی خوبی جو معاشرے کے دیگر افراد کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ یہ صفت یا خوبی اچھائی یا برائی دونوں حوالوں سے ہو سکتی ہے اور انہی خصوصیات کی بنا پر انسانی تہذیبوں اور ان کے تمدن کی بھی پہچان ہوتی ہے۔ انسانی سیرت و کردار میں اخلاق اور اخلاقی اقدار کا بہت

عمل دخل ہوتا ہے انہی اقدار کی وجہ سے انسانی شخصیت میں نکھار پیدا ہوتا ہے اور بہترین کردار سازی سے اچھے عمل کی بھی پہچان کی جاتی ہے۔ انسانی اعمال و افکار اور طرز زندگی میں حسن بیان کی اہمیت بھی اسی اخلاق اور اخلاقی اقدار کی وجہ سے ہی تسلیم کی جاتی ہے۔ جہاں تک علم الاخلاق کا تعلق ہے تو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی لکھتے ہیں:

> "اس سے مراد وہ علم جو بھلائی اور برائی کی حقیقت کو ظاہر کرے اور اس کو بیان کرے کہ انسانوں کو آپس میں کیسے معاملہ کرنا چاہیے اور اس کو واضح کرے کہ لوگوں کو اپنے اعمال میں کس منتہائے نظر اور مقصد عظمٰی کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور مفید اور کار آمد باتوں کے لیے دلیل راہ بنے"۔ [4]

گویا علم الاخلاق کا موضوع دو قسم کے اعمال پر مشتمل ہے: اول: وہ اعمال جو انسان کے اختیار و ارادہ سے صادر ہوتے ہوں اور عمل کے وقت جن کے بارے میں وہ خوب جانتا ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ دوم: وہ اعمال جو عمل کے وقت اگرچہ بغیر ارادہ صادر ہوتے ہیں لیکن اختیار، شعور اور ارادہ کے وقت ان کے متعلق احتیاط برت سکتا ہے۔ اور یہی وہ اعمال ہیں جن پر خیر اور شر یا اچھے اور برے ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔ [5] ایک اور جگہ پر مولانا سیوہاروی اسی امر کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "نفس انسانی اپنے کردار میں تین امور میں سے کسی ایک امر سے متعلق ہوتا ہے۔ ایک طبیعت، دوسرا حال اور تیسرا ملکہ ہوتا ہے۔ طبیعت جبلت کا نام ہے جس میں تغیر و تبدل کا قطعی امکان نہیں، حال نفس کی اس کیفیت کا نام ہے جس سے استبداد قبول کی بنا پر نفس متکیف ہوتا مگر جلد ہی زوال بھی قبول کر لیتا ہے، جب کہ ملکہ اس کیفیت یا قوت کا نام ہے جو نفس انسانی میں راسخ ہو جاتی ہے اور اس کا زوال ہو تو سکتا ہے لیکن بمشکل اور بتاخیر۔ اس کے بعد یہ واضح ہے کہ خلق ان تینوں کیفیات میں سے نفس کی اس کیفیت سے متعلق ہوتی ہے جو ملکہ کہلاتی ہے اور اس کا حال مزاج سا نہیں ہے۔ لہذا علم الاخلاق کے ذریعے اس کی تہذیب و اصلاح ممکن ہے"۔ [6]

گویا علم الاخلاق سے مراد وہ انسانی اوصاف و کمالات اور کردار جس کے متعلق بحث کی جاتی ہے تاکہ ان اوصاف کی بنیاد پر انسانی شخصیت کی پہچان ہو سکے اور انہی اوصاف کی بنیاد پر انسانی شخصیت میں نکھار پیدا ہو جو انسانی شخصیت میں توازن کے معیار کو بھی برقرار رکھے۔

سماجی اخلاق کا تصور

معاشرتی زندگی میں انسانوں کا باہم مل جل کر رہنا فطری سمجھا جاتا ہے اور اجتماعی زندگی میں تمام انسان باہمی تعلقات بھی بنائے رکھتے ہیں۔ انہی تعلقات میں سے ایک تعلق ازدواجی زندگی سے متعلق بھی ہے، معاشرتی زندگی میں جب ازدواجی تعلقات قائم ہوتے ہیں تو پھر مختلف رشتوں کا تصور بھی وجود میں آتا ہے۔ ان ابدی اور وقتی رشتوں کے

ساتھ زندگی گزارنے کو سماجیات کا نام دیا جاتا ہے اور اس سماجی زندگی میں رہن سہن، باہمی تعلقات، ازدواجی نظام اور معاشرے کے دیگر افراد کے ساتھ ان کے ربط و تعلق کو بھی دیکھا جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ مختلف معاشروں میں لوگ سماجی زندگی میں کن رویوں کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان رویوں میں ان کی کون سی خصوصیات غالب ہیں، انہی خصوصیات کی بنا پر ان کی پہچان ہوتی ہے۔ یہ وہ اوصاف و خصوصیات ہیں جو انسان کی سماجی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ انسانی تہذیبوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام غیر متمدن اور متمدن معاشروں کے افراد مختلف اوصاف اور خصوصیات رکھتے تھے۔ ان اوصاف میں سے کچھ کا تعلق انسانی رویوں کے ساتھ تھا اور کچھ کا تعلق سماجی زندگی کے نظام حیات سے تھا۔

جب ہم سماجی زندگی میں اخلاق کی بات کرتے ہیں تو یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ اخلاق عادات، طور اطوار اور کردار کا نام ہے، اس لیے سماجی نظام زندگی میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ سماجی زندگی میں انسان کن عادات، طور اطوار اور کس کردار کے تحت زندگی بسر کرتا ہے۔ انسان کی معاشرتی زندگی میں سماج کی اپنی اہمیت اور شناخت ہے اور سماج میں انسان باہم مل جل کر خاندانی نظام کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ ہر خاندانی نظام میں خاندانی رشتے ہوتے ہیں اور پھر ان رشتوں کی اساس پر خاندانی زندگی پروان چڑھتی ہے۔ سماجی ارتقاء میں بھی خاندانی نظام اپنی اہمیت رکھتا ہے اور خاندان کا ارتقاء شادی بیاہ کے تصور سے مربوط ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس سے سماج کی عملی تکمیل بھی ہوتی ہے، اس لیے پوری سماجی زندگی میں اچھی عادات اور مثالی کردار کے تحت زندگی گزارنے کو سماجی اخلاقیات کا نام دیا جاتا ہے۔

اخلاق وہ بنیادی لائحہ عمل ہے جو سماجی زندگی میں اعلیٰ معیارات کے قیام کا باعث بنتا ہے اور تمام انسانی تہذیبوں میں انسان کی سماجی زندگی بہت اہمیت کی حامل اس لیے بھی ہوتی ہے کہ اسی زندگی سے معاشرے میں ان کا مقام پیدا ہوتا ہے اور یہی سماجی زندگی تہذیبی شعور کے ادراک اور تمدنی زندگی کے فہم کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ اگر ان انسانی تہذیبوں کو تمدنی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ تہذیبیں وقت کے بہاؤ میں اتار چڑھاؤ کا شکار رہی ہیں اس لیے انسان کی تہذیبی زندگی بھی روایات کا شکار رہی ہے۔ ہر ایک تہذیب میں سے انسان کی سماجی زندگی میں اخلاقیات اور ان کے طرز معاشرت کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ محمد مجیب "تاریخ تمدن ہند" میں لکھتے ہیں:

> "انسانی زندگی تمدن اور تہذیب کے اعتبار سے کبھی ہموار نہیں رہی، آج کل کی طرح پہلے بھی بعض قومیں ایسی تھیں جنہوں نے بہت ترقی کر لی تھی اور بعض ایسی جو بالکل وحشی تھیں، ترقی کرنے والی قوموں میں ہر ایک کی رفتار الگ تھی۔ بعض قومیں برابر ترقی کرتی رہیں، اور بعض کی ترقی ایک حد تک پہنچ کر رک گئی۔ قدیم یونانیوں نے تھوڑی سی مدت میں فکر اور عمل، فن اور ادب کے لاجواب کرشمے دکھائے اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔ رومیوں نے علم اور فن میں

دروزہ گری کی۔ مگر سیاست، تنظیم اور استقلال کی ایک مثال قائم کر گئے جس سے دنیا صدیوں تک سبق لیتی رہی"۔[7]

یہ تو ان قوموں کے احوال تھے جنہوں نے دنیا میں عروج حاصل کیا اور بہت سے نقوش چھوڑے۔ یہ نقوش زندگی کے ہر پہلو کے حوالے سے قدیم تاریخی کتب میں مل جاتے ہیں۔ مگر جہاں تک شہری اور سماجی زندگی کا تعلق ہے تو جان ایس ہائی لینڈ اپنی کتاب "مختصر تاریخ تمدن" میں اہل یونان کی شہری زندگی کے بارے میں لکھتا ہے۔

"یونانی شہری ریاست کے باشندے اپنے آپ کو ایک مشترک مورث اور بانی کی اولاد اور آپس میں ایک دوسرے کو اپنا رشتے دار تصور کرتے تھے۔ یہ لوگ اپنے شہر کے حسن و جمال، شہر کی عبادت گاہوں اور نفیس عمارتوں، اس کے اداروں، اس کی آزادی، اس کے قدیم مشاہیر اور اس کے مشہور کارناموں پر بڑا فخر کیا کرتے تھے اپنے شہر کے لیے لڑائی میں اپنی جانیں خوشی سے نثار کر دیتے تھے۔ یونانی شہری ریاست اگرچہ چھوٹی ہوتی تھی اور اس کے اغراض و مقاصد نہایت محدود تھے، تاہم وہ حقیقی تہذیب کا گہوارہ تھی۔ یہ ریاست ساری دنیا کے لیے اس بات کی مثال تھی کہ کس طرح عملی اداروں اور نہایت اچھی طرح وضع کیے ہوئے قانون کے ذریعے ایسی تہذیب کی نشو نما اور تکمیل ہو سکتی ہے"۔[8]

اگر اہل یونان کا جائزہ لیا جائے تو ان کے ہاں ابتدائی معاشرت مختلف معیارات پر قائم تھی۔ اہل یونان میں ایتھنز[9] اور اسپارٹا کا تصور واضح طور پر ملتا ہے، ان میں ایتھنز کے مقابلہ میں اہل اسپارٹا زیادہ متمدن سمجھے جاتے ہیں۔ پروفیسر ہولم اپنی کتاب تاریخ یونان قدیم میں اہل اسپارٹا کی طرز معاشرت اور علوم وفنون کے حوالے سے رقم طراز ہے:

"یہ درست ہے کہ اسپارٹی تعلیم اور اسپارٹی علوم وفنون کی نوعیت ایک مدرسے کی سی تھی اس کے لیے جو بھی طریقے استعمال کیے جاتے تھے وہ انسان کے شریفانہ اور کشادہ دلی کی امنگ کو ابھارتے، اس میں زندگی کی سادگی، خودداری، فطری اور معاشرتی بزرگوں کا پاس ولحاظ اور وسیع ترین معنوں میں اعلیٰ قوتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا سکھایا جاتا تھا۔ ان سب باتوں کا رتبہ قانون کا تھا اور ان پر نہایت سختی سے عمل درآمد ہوتا تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ اسپارٹا نہ ہوتا تو یونان کی اخلاقی زندگی کی تصویر نامکمل رہ جاتی"۔[10]

انسانی تہذیبوں میں رومی تہذیب زیادہ متمدن معلوم ہوتی ہے، مگر ان کی معاشرتی وسماجی زندگی کا مطالعہ کریں تو ان کا مختلف طرز معاشرت سامنے آتا ہے۔ رومی معاشرت آزاد اور غلام کی تقسیم کا شکار تھی، جرائم اور سزاؤں میں اس تفریق کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا۔ آزاد کے جرم کی سزا کم اور غلام کی سزا زیادہ تھی، اسی طرح اشراف اور رعایا کا معاملہ

بھی تھا۔ گویا معلوم ہوتا ہے کہ رومی معاشرت طبقاتی تقسیم کا شکار تھی جس میں کمزور طبقے کو اخلاقی روایات کے برعکس کم تر تصور کیا جاتا تھا۔ رومی معاشرے کا جائزہ لیں تو تین طبقات میں بٹا ہوا نظر آتا ہے۔ سید امیر علی "روح اسلام" میں رومی معاشرت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رومی معاشرہ واضح طور پر تین طبقات میں بٹا ہوا تھا۔ پہلا طبقہ ہونیسٹائرز (Honestoires) یعنی امراء، دوسرا طبقہ ہیمولائرس (Humeloires) یعنی عوام کا اور تیسرا طبقہ سروی (Servi) یعنی زرعی مزدوروں اور غلاموں کا تھا۔" رومیوں کے یہاں اولین ایام سے غلام چلی آرہی تھی، غلام خواہ ملکی ہوں یا غیر ملکی، جنگ میں ہاتھ آئے ہوں یا خریدے گئے ہوں۔ خالی خولی مال و اسباب سمجھے جاتے تھے۔ ان کے آقاؤں کو ان کی موت وزندگی کا اختیار تھا"۔[11]

رومی قانون نے جو طبقاتی تقسیم کی تھی اسی طرح کی تقسیم ایرانیوں کے ہاں بھی ملتی ہے، ایرانی معاشرہ چار طبقات پر مشتمل تھا:

۱۔ مذہبی طبقہ (آذرواں)　　۲۔ فوجی طبقہ (ارتشتیاراں)

۳۔ عمال گروہ (دبیراں)　　۴۔ ہنر مندی کا شکار (استر بوشال و دہتخشاں)

ہر گروہ کے ذمہ کام تھے اور ایک طبقہ کا شخص دوسرے طبقہ میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ چوتھے طبقہ کا کوئی شخص نہ سرکاری ملازم ہو سکتا تھا اور نہ اعلیٰ طبقات کی جائیداد خرید سکتا تھا۔[12]

اگر ہم اسلامی تہذیب کا مطالعہ کریں تو اسلام نے طبقاتی تقسیم کو ختم کر کے تمام انسانوں کو مساوی درجہ دیا۔ امیر و غریب، حاکم و محکوم کی تقسیم ختم کی اور معاشرے کے تمام افراد کو برابر مواقع دے کر حقوق و فرائض کا تصور بھی دیا۔ ہر طبقے کو اس کے حقوق سے متعلق آگاہ کر کے اسے دوسروں کے فرائض میں شامل کر دیا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا[13]

"اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تم میں شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو"۔

اس سے معلوم ہوا کہ ذاتیں، قبیلے اور برادریاں سب محض ایک دوسرے کی پہچان کے لیے ہیں۔ اصل مقصد انسانیت کی تکریم ہے تاکہ سماجی زندگی میں تمام افراد ایک دوسرے کا خیال رکھیں اور پھر اسی سے محبت و اخوت اور رواداری کے جذبے بھی فروغ پاتے ہیں۔ سماجی اخلاقیات کا یہ تقاضا ہے کہ معاشرے کے تمام افراد کے درمیان مساوی سلوک کیا جائے تاکہ کسی بھی شخص کی عزت نفس مجروح نہ ہو اور ایک دوسرے کی عزت و احترام بھی برقرار رہے۔ در

اصل یہی وہ سماجی اخلاقی تقاضے ہیں جس کی بار بار تعلیم دی جاتی ہے۔ قدیم انسانی تہذیبیں اس سماجی اخلاقیات سے عاری نظر آتی ہیں کیونکہ وہ طبقات میں منقسم تھیں ہر طبقے کا اپنا معیار تھا جس سے وہ کم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا، عورتوں، غلاموں اور مزدوروں کے ساتھ ظلم و جبر سے پیش آتے تھے۔ اسلامی تہذیب نے نہ صرف اس طبقاتی تقسیم[14] کو ختم کیا، بلکہ عورتوں اور غلاموں کو معاشرے میں ایک مقام دیا اور اخلاقی اقدار کی تعلیم دی۔

سماجی زندگی کا حقیقی مقصد

اگر ہم انسانی تہذیبوں میں سماجی زندگی کی بات کریں تو یہ زندگی مختلف نوعیتوں میں بکھری نظر آتی ہے۔ ان تہذیبوں میں معاشرتی زندگی کو قائم و دائم رکھنے کے لیے سماجی زندگی کا تصور ملتا ہے جس میں رہن سہن، جنسی تسکین، افزائش نسل اور سماجی تعلقات وغیرہ شامل ہیں۔ جان ایس ہائی لینڈ اپنی کتاب "مختصر تاریخ تمدن" میں انسانی طرز حیات کے بارے میں لکھتا ہے:

"انسان نے اپنے ماقبل مورثوں سے بہت سی جبلتیں[15] ورثے میں پائی ہیں اور یہ جبلتیں اب تک افراد اور جماعتوں کی زندگی اور سرگرمی میں پوشیدہ ہیں۔ اگرچہ انہیں ان کے اثر کا شعور نہیں مگر ایسی جبلتیں انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ موت سے بچے اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی سعی کرے۔ یہ انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ بچوں کی پرورش کے ذریعے نسل کو برقرار رکھے اور وہ انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ہر اس چیز کی مدافعت کرے جو اس کی یا اس کے بچوں اور دوستوں کی سلامتی کو خطرے میں ڈالے۔ یہ انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ باہم مل کر خاندان، قبیلہ اور قوم کی صورت اختیار کرے تا کہ بہتر سے بہتر طریقے پر تحفظ ذات اور آسودگی حاصل کرے"۔[16]

ول ڈیورانٹ "انسانی تہذیب کا ارتقاء" میں زندگی کی حقیقت، تہذیب کے مقاصد اور اخلاقی اقدار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"لالچ کو کفایت شعاری، تشدد کو استدلال، قتل کو قانونی چارہ جوئی اور خودکشی کو فلسفے میں تبدیل کرنا تہذیب کے مقاصد کا حصہ رہا ہے۔ جب طاقت ور نے کمزور کو قانونی طریقے سے کھانا شروع کیا تو ایک لحاظ سے یہ بہت بڑی ترقی تھی۔ کوئی بھی معاشرہ اس صورت میں قائم نہیں رہ سکتا اگر وہ اپنے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اسی سلوک کی اجازت دے جو وہ دوسرے گروہوں کے ساتھ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ خارجی مقابلے کے لیے داخلی تعاون پہلا قانون ہے، جہد بقاء امداد باہمی پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ گروہ کو منتقل کی جاتی ہے۔ دوسرے حالات کے ساتھ ساتھ دشمن گروہوں سے مقابلہ کرنے کی اہلیت متحد ہونے کی انفرادی اور خاندانی اہلیت کے متناسب ہو گی۔ چنانچہ ہر

معاشرہ ایک اخلاقی ضابطہ سکھاتا ہے اور فرد کے اندر معاشرتی مزاج پیدا کرتا ہے جو زندگی کی فطری جنگ کو دباتا ہے۔ ان خوبیوں یا عادات کو جو معاشرے کے لیے فائدہ مند ہوتی ہیں اچھائیاں کہہ کر فرد کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جبکہ ان کے برعکس عادات کو برائیاں کہہ کر ان کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ اس طرح فرد خارجی اعتبار سے معاشرتی انسان اور جانور شہری بن جاتا ہے"۔[17]

اگر ہم اسلامی تہذیب کی بات کریں تو اس میں انسانی تخلیق ایک خاص مقصد کے تحت ہوئی، اس کو ہدایات دے کر اس دنیا میں بھیجا گیا تاکہ وہ اللہ کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے باہمی تعلقات قائم کرے اور اپنی نسل کو آگے بڑھائے۔ گویا افزائش نسل کے لیے نکاح کا تصور دیا، ایک دوسرے کی پہچان کے لیے ذاتیں، برادریاں اور قبیلے بنا کر ایک قوم کا تصور دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سماجی شعور دے کر اخلاقی رویوں کی پہچان دی تاکہ انسان اپنی عزت و تکریم کو قائم رکھتے ہوئے سماجی زندگی گزارے۔

سماجی اخلاقی ضوابط

منظم زندگی گزارنے کے لیے انسان ایسے اصول و قواعد بناتا ہے جن کے تحت زندگی کو اس انداز میں گزارے کہ اس سے اس کی خوبیاں نکھر کر سامنے آئیں۔ یہ کائنات بھی ایک اصول و ضابطے کے تحت وجود میں آئی اور انسانی تخلیق بھی ایک خاص مقصد کے تحت ہوئی۔ پھر انسان کو شعور دے کر اس دنیا میں بھیجا تاکہ وہ اپنے ان شعوری رویوں سے زندگی گزارنے کے طریقے دریافت کرے اور پھر ان طریقوں کو منظم کرتا رہے۔ منظم زندگی گزارنے کے لیے انسان نے اپنے طور پر کچھ اصول و ضوابط بنائے اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ جب انسانی تہذیبیں متمدن ہونا شروع ہوئیں تو پھر اللہ کی طرف سے ہدایات بھی آنے لگیں ان ہدایات میں زندگی گزارنے کے کچھ اخلاقی اصول و ضوابط بھی دیئے گئے جن کی تکمیل اسلامی تہذیب سے ہوئی۔

اگر انسانی تہذیبوں کا مطالعہ کریں تو ان تہذیبوں میں انسانی زندگی ان اصول و ضوابط کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، کیونکہ طاقتور اپنی طاقت کا استعمال کر کے اور با اختیار اپنے اختیارات کا استعمال کر کے اپنی مرضی سے زندگی گزار لیتا ہے۔ اس میں مفاد پرستی، لالچ، حرص اور حسن پرستی جیسی صفات بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ قدیم تہذیبوں میں آزادانہ زندگی کا تصور موجود تھا، تمام انسانی معاشروں میں ہر شخص اپنے انفرادی تشخص کو قائم کرنے کے لیے ہر وہ فعل سرانجام دیتا تھا جس کو وہ اپنے لیے ضروری سمجھتا تھا۔ ان میں خود ساختہ قدریں تو موجود تھیں مگر یہ بات ضروری تھی کہ ان کی زندگی میں اصول و ضوابط بھی متعارف کرائے جائیں تاکہ وہ ان حدود قیود کے ساتھ زندگی بسر کریں اور سماجی زندگی میں اخلاقی اقدار کو فروغ بھی دیں۔ ول ڈیورانٹ "انسانی تہذیب کا ارتقاء" میں لکھتا ہے:

"تاریخ میں اخلاقی ترقی ضابطوں کی اصلاح سے زیادہ اس علاقے کی توسیع پر منحصر ہے۔ جس میں

اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جدید انسان کی اخلاقیات لازمی طور پر غیر متمدن انسان سے اعلیٰ نہیں۔ اگرچہ دو ضابطوں کے گروہ اپنے موضوع، عمل اور پیشے میں ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہو سکتے ہیں۔ لیکن جدید اخلاق کو عام حالات میں پہلے کی نسبت زیادہ انسانوں تک وسعت دی جاسکتی ہے۔ جوں جوں قبیلے زیادہ بڑی وحدت ریاست میں اکٹھے ہوتے گئے اخلاقیات قبائلی حد بندیوں سے باہر نکل گئی اور جوں جوں ذرائع ابلاغ اور مشترکہ خطرے سے ریاستیں متحد ہوئیں تو اخلاق سرحدوں سے باہر نکلا اور بعض افراد اپنے احکام کا اطلاق تمام یورپیوں، تمام سفید فاموں اور آخر کار تمام انسانوں پر کرنے لگے"۔[18]

وہ مزید لکھتا ہے۔

"اخلاقی ضابطے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ نامتبدل یا بتدریج تغیر پذیر انسانی فطرت کے ہیجانات کو معاشرتی زندگی کی متغیر ضرورتوں اور حالات کے مطابق بنائے۔ لالچ اکتسابیت، بے ایمانی، ظلم اور تشدد جانوروں اور انسانوں کی بہت ساری نسلوں میں بہت مفید تھا جسے ہمارے تمام قوانین، تعلیم، اخلاقیات اور مذاہب ختم نہ کر سکے۔ ان میں سے بعض آج بھی موجود ہیں۔ جانور خوب ٹھونس کر کھاتا ہے کہ کیونکہ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اسے دوبارہ کھانا کب ملے گا۔ یہ بے یقینی لالچ کی بنیاد ہے"۔[19]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سماجی زندگی میں اخلاقیات اور اخلاقی ضوابط کا محدود تصور تھا، کچھ تہذیبوں میں تو انسان تہذیبی شعور سے بھی آگاہ نہیں تھے بلکہ زندگی کا کل وقتی مقصد خوراک کا حصول تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایسے معاشرے فطرت کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے سے بھی قاصر رہے۔ اہل ایتھنز کے ہاں اس کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ قدیم تہذیبوں میں کچھ معاشرے ایسے بھی تھے جو اخلاقی تصور سے آگاہ تھے مگر اس کو اپنی زندگی کا مقصد اور نصب العین نہیں بنایا تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے جیسے معاشرہ ترقی کرتا گیا اور سماجی زندگی کا نظام وسیع ہوا تو متمدن قوموں میں اخلاقیات کا شعور بھی اجاگر ہوتا گیا اور وہ اپنی زندگی کو اصول وضوابط کے سانچوں میں ڈھالتے گئے۔

سماج کے اخلاقی روابط

اجتماعی زندگی میں انسانی روابط بھی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ سماجی زندگی ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اس لیے سماجی زندگی کی تکمیل کے لیے انسانی روابط وجود میں آتے ہیں۔ جہاں تک انسانی تہذیبوں میں ان روابط کا تعلق ہے توان میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ انسانی روابط کن بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں اور یہ بنیادیں انسانی اخلاقیات پر کس حد تک اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ انسانی روابط کی نوعیت مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ قدیم اور جدید

تہذیبوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ متمدن اور غیر متمدن تہذیبوں میں سماجی روابط کی مختلف نوعیتیں سامنے آتی ہیں۔ ول ڈیورانٹ "انسانی تہذیبوں کا ارتقاء" میں سماجی روابط کے حوالے سے رقم طراز ہے:

"غیر متمدن انسان ہم عصر انسان کے مقابلے میں اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے زیادہ آمادہ رہا تھا، اس میں سماجی یگانگت زیادہ پیدا ہوئی کیونکہ اسے زیادہ خطرات کا سامنا تھا اور اس کے اپنے گروہ کے ساتھ زیادہ مفادات وابستہ تھے۔ اس کے پاس ملکیت کم تھی جو اسے دوسرے ساتھیوں سے جدا کرتی۔ فطری انسان زور آور اور لالچی تھا، لیکن وہ مہربان اور فیاض بھی تھا۔ اجنبیوں کے ساتھ شراکت پر اور مہمانوں کو تحفے دینے میں خوشی محسوس کرتا۔ بہت سے غیر متمدن قبیلوں میں مہمان نوازی اس انتہا پر تھی کہ میزبان اپنے مہمان کو بیوی یا بیٹی پیش کر دیتا تھا۔ ایسی پیش کش کو ٹھکرا دینا نہ صرف میزبان بلکہ اس عورت کی بھی ہتک شمار ہوتی"۔[20]

اس سے سماجی اخلاقیات کی دو نوعیتیں ہمارے سامنے آتی ہیں ایک تو سماجی روابط بڑھانے کے لیے مہمان نوازی کا تصور ملتا ہے، جس سے آپس میں محبت کے رشتے قائم ہوتے ہیں اور سماج اخلاقی ترقی کرتا ہے۔ دوسری نوعیت اخلاق زوال کی طرف پیش قدمی کی ہے، جہاں کچھ معاشروں میں سماجی روایت کے مطابق میزبان مہمان کو ضیافت کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی یا بیٹی بھی بطور تحفہ پیش کرتا ہے۔ مہمان کا اس تحفہ سے انکار معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اگر مہمان اس تحفہ کو قبول نہ کرتا تو میزبان اپنے لیے یہ کم تری محسوس کرتا تھا۔ اس وجہ سے محرم رشتوں کی تقدیس پامال ہونے لگی اور اس سے سماج بھی اخلاقی زوال کا شکار ہو گیا۔ اسلام نے جہاں مہمان نوازی کی تعلیم دی وہیں اس کے اصول و آداب بھی بتا دیئے تاکہ اس باہمی رشتے کے ذریعے سماج میں اخلاقی اقدار کو قائم کیا جا سکے۔

جہاں تک سماجی روابط کا تعلق ہے تو ایک تعلق جس کا ہر معاشرے میں تصور ملتا ہے وہ ہے جنس کی بنیاد پر تعلق قائم کرنا۔ مختلف معاشروں میں اس کی شکلیں مختلف رہی ہیں، مگر ہر دور میں مرد اور عورت نے ایک دوسرے سے تعلق قائم کیا اور جنسی تسکین حاصل کی۔ کچھ تہذیبوں میں عورت محض جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھی گئی اور اس کو معاشرے میں وہ مقام اور عزت نہیں دی گئی جس کے لیے اس کی تخلیق ہوئی۔ اگر ہم اسلامی تہذیب کا مطالعہ کریں تو اسلام نے عورت کو وہ مقام اور عزت دی جو دیگر معاشروں میں نہیں ملتی۔

۱۔ شادی بیاہ کا تصور

سماجی روابط کا ایک اہم ذریعہ شادی بیاہ کا تصور ہے، اس سے سماجی رشتے وجود میں آتے ہیں اور خاندان کی بنیادیں ملتی ہیں۔ اسلامی معاشرہ میں خاندان کی ابتداء ایک مرد اور عورت کے نکاح سے ہوتی ہے۔ نکاح ہی خاندانی نظام کی بنیادی اکائی کے طور پر سامنے آتا ہے، اس لیے اس کی اہمیت اور سماجی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نکاح ایک

انفرادی تمدنی ضرورت بھی ہے جسے تمام معاشروں نے تسلیم کیا ہے لیکن قرآن و سنت نے اس پہلو کے علاوہ اسے سماجی زندگی میں اخلاقی ضرورت بھی قرار دیا ہے اور اس کے قیام پر بہت زور دیا ہے۔ قرآن کریم نے تو اسے سنت انبیاء قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً[21]

"اور ہم نے یقیناً آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیویاں اور بچے بھی دیئے"۔

اسی لیے میاں بیوی کے تعلق کے لیے اسلام نے جو اصلاح متعارف کرائی ہے اس کو نکاح کا نام دیا ہے۔ نکاح ہی وہ قانونی ضابطہ ہے جس کے تحت زوجین (میاں بیوی) معاشرے میں باعزت طریقے سے رہ سکتے ہیں اور پھر ان کی ہونے والی اولاد کے لیے بھی قانونی جواز کے تمام تقاضے پورے کر دیئے ہیں۔ یہ وہ معاشرتی تقاضے ہیں جو خاندان کی مضبوطی اور استحکام میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ نکاح کی اہمیت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ[22]

"اور اپنے غیر شادی شدہ آزاد افراد اور اپنے غلاموں اور کنیزوں میں سے باصلاحیت افراد کے نکاح کا اہتمام کرو کہ اگر وہ فقیر بھی ہوں گے تو خدا اپنے فضل و کرم سے انہیں مالدار بنا دے گا کہ خدا بڑی وسعت والا اور صاحبِ علم ہے"۔

اگر ہم قدیم انسانی تہذیبوں کا مطالعہ کریں تو تمام انسانی تہذیبوں میں شادی کا تصور مختلف انداز میں نظر آتا ہے۔ ذیل میں ان کا جائزہ لیتے ہیں۔

پروفیسر ہولم اپنی کتاب تاریخ یونان قدیم میں اہل اسپارٹہ کے ہاں رسم نکاح کے حوالے سے لکھتا ہے:

"ہر زمیندار اور شہری کو نکاح کرنا لازمی تھا اور اگر اولاد نہ ہوتی تو طلاق لازمی آتی تھی۔ اسپارٹی شادی بیاہ کو بالکل اسی نظریے سے دیکھتے تھے جیسے کوئی کاشتکار اپنے مویشی کی نسل کو دیکھتا ہے"[23]

ول ڈیورانٹ "انسانی تہذیب کا ارتقاء" میں لکھتا ہے۔

"متعدد قبیلوں میں کوئی عورت اس وقت تک کسی مرد سے شادی نہیں کرتی تھی جب تک اس نے جائز یا ناجائز طریقے سے کسی شخص کو قتل نہ کیا ہو۔ چنانچہ سر کا شکار کرنے کا دستور آج بھی فلپائن میں موجود ہے۔ وہ ڈیاک جو ایسے شکار میں سب سے زیادہ سر اتار لاتا وہ اپنے گاؤں کی کسی بھی لڑکی کو منتخب کر کے شادی کر سکتا تھا۔ وہ اس کی نظر عنایت کی طلب گار تھیں کیونکہ اس کے پیچھے یہ احساس کارفرما تھا کہ اس کے ذریعے وہ بہادر اور مردمار قسم کے بچوں کی ماں بن سکیں گی"[24]

پروفیسر ہولم اپنی کتاب تاریخ یونان قدیم میں لکھتے ہیں:

"عام طور پر لوگ ایک ہی بیوی پر قناعت کرتے، قاعدے کے مطابق دلہن کے باپ کو خواہ روپیہ ورنہ خدمات کی شکل میں معاوضہ ملتا اور خود دلہن کو بھی مہر ادا کیا جاتا تھا"۔[25]

یونانی تہذیب جو سب سے قدیم تصور کی جاتی ہے اس لیے سماجی کی بنیادیں بھی اس دور سے ملتی ہیں۔ یونان میں دو ریاستوں کا تصور ملتا ہے ان میں ایک ایتھنز اور دوسری اسپارٹا ہے۔ ان کے ہاں سماجی اخلاقیات کا یہ تصور تھا ہر شخص اپنی مرضی سے جس عورت سے چاہتا نکاح کر لیتا تھا اور اگر اولاد نہ ہوتی تو اس کو طلاق دے کر چھوڑ دینا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کچھ قبیلوں میں تو عورت صرف اس مرد سے شادی کرتی تھی جو طاقتور اور قاتل ہو اور اپنے اس کام میں شہرت بھی رکھتا ہو۔ گویا طاقت اور خون ریزی ہی مردانگی کی نشانی سمجھی جاتی تھی اور وہ عورتیں یہ اس لیے کرتیں تاکہ ان کے بچے بھی اس طرح بہادر ہوں۔ کچھ معاشروں میں تو سماجی اخلاقیات کا یہ تصور تھا کہ شادی بیاہ کے لیے لڑکی والدین کو مال و دولت یا خدمت دے کر لڑکی کو خرید لیا جاتا تھا پھر لڑکی کو حق مہر بھی دیا جاتا تھا۔ دور جدید کے معاشروں میں بھی ایسی رسمیں ابھی تک موجود ہیں جہاں شادی کے لیے باقاعدہ طور پر مالی لین کے ذریعے لڑکی کو زر خرید غلام بنا لیا جاتا ہے اور پھر اس کے ساتھ جیسا چاہیے سلوک کیا جاتا ہے، گویا لڑکی ہمیشہ کے لیے اس کی محکوم بن جاتی ہے۔

مصری تہذیب میں آشوری اور کلدانی (جو ایک کاشتکار قوم تھی) قومیں بہت مشہور تصور کی جاتی ہیں۔ آشوری آداب و تمدن میں بالکل کلدانیوں کے مقلد تھے۔ اگر ان کے طرز معاشرت پر نظر ڈالیں تو بادشاہ اور امراء کئی کئی بیویاں رکھتے تھے اور ان کو گھروں میں قیدیوں کی طرح رکھتے تھے۔ کوئی ان کے سامنے نہیں جا سکتا تھا اور نہ وہ عورتیں مکان سے باہر نکل سکتی تھیں[26]۔

رومی مؤرخ ٹیاسی ٹس لکھتا ہے:

"پہلی صدی عیسوی میں شادی بیاہ اور پرورش اولاد بالکلیہ فیشن کے خلاف سمجھی جاتی تھی، اپنے بعد وارث ہونے کے لیے بچے نہ رکھنے کا فائدہ نافرمانی کی سزا سے زیادہ سمجھا جاتا تھا"۔[27]

اہل مصر میں شادی بیاہ کے حوالے سے سماجی اخلاقیات کا یہ تصور تھا کہ بادشاہ کی کئی کئی بیویاں ہوتی تھیں جن کو قیدی بنا کر رکھا جاتا تھا اور ان کو گھر سے باہر جانے کی بھی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ کوئی بھی شخص اپنی، قبیلے، ذات اور برادری کے باہر شادی نہیں کر سکتا تھا گویا طبقاتی تقسیم کا اعلیٰ نظام موجود تھا اور اسی کو سماجی اقدار کا نام دیا جاتا تھا۔ کچھ معاشروں کی سماجی حالت یہ تھی کہ شادی محض جنسی تسکین کا ذریعہ بن کر رہ جاتی تھی۔ خواتین سے اولاد کو پیدا کرنے یا ان کی پرورش کرنے کا اختیار ان سے چھین لیا جاتا تھا۔ جو شخص اپنے وارث کی خواہش کرے اس کو معاشرے کے لیے نافرمان تصور کیا جاتا تھا۔

جہاں تک شای بیاہ کا تعلق ہے تو اسلام نے اس کے لیے نہ صرف اخلاقی قوانین دیئے بلکہ نبی کریم ﷺ نے اپنا اسوہ بھی پیش کیا۔ اسلامی تہذیب میں لاتعداد شادیوں کا کوئی تصور نہیں، بلکہ ایک حد تک شادیاں کی جاسکتی ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ بیویوں کی سماجی حقوق بھی پورے کیے جائیں گے، ان کی ضروریات کا خیال رکھا جائے گا۔ شادی کو محض جنسی تسکین کے برعکس اولاد کا تصور موجود ہے، ان کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے مکمل تعلیمات ہیں یہاں تک وارث ہونے کی صورت میں ان کے تمام معاشی حقوق کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

جہاں تک رومی معاشرت کا تعلق ہے تو اس حوالے سے سید امیر علی لکھتے ہیں

"رومی معاشرہ میں غلام اور لونڈی کی باہمی شادی قانونا تسلیم نہیں کی جاتی تھی جب کہ غلام مرد کی شادی آزاد عورت سے اور آزاد مرد کی شادی غلام عورت سے قطعا ممنوع تھی۔ اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام سے شادی کرلیتی تو اس کے لیے سزاؤں میں سے ایک سزا یہ تھی کہ وہ قتل کردی جائے اور غلام کو زندہ جلادیا جائے۔ اخلاقی انحطاط کی ایک خطرناک علامت یہ تھی کہ ان کے درمیان شادی ایک بے معنی رسم بن گئی تھی جبکہ قوانین مملکت کی تائید حاصل کرکے داشتہ بازی ایک ایسا ادارہ بن گئی تھی جو مراعات خاص کا مستحق تھا"۔[28]

جہاں تک روم کی سماجی زندی کا تعلق ہے تو سید امیر علی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رومی معاشرے میں بیویوں کی حالت بھی زیادہ خوشگوار نہیں تھی۔ پہلی بیوی کے سوا کسی کو قانونی حقوق حاصل نہیں تھے۔ ان حقوق سے محروم بیویوں کے بچے بھی جائز نہیں سمجھے جاتے تھے اور وہ اپنے باپ کی جائیداد میں سے ایک حصہ کے بھی حق دار نہیں ہوتے تھے اور سماج میں ذات پات سے خارج شمار کیے جاتے تھے اونچے طبقے کے مرد اگر نچلے طبقے کی عورت سے شادی کرتے تو شرائط نکاح میں سے ایک شرط یہ ہوتی کہ اولاد کو کوئی حق وراثت نہیں پہنچے گا۔ ایسی شادیوں کی علامت یہ ہوتی تھی کہ دولہا اپنا بایاں ہاتھ دلہن کو تھما دیتا تھا گویا ہونے والی اولاد کو وراثت کا حق نہیں ہوگا"۔[29]

اہل روم کی سماجی زندگی طبقاتی تقسیم کا شکار تھی۔ سماجی اخلاقیات کا یہ تصور تھا کہ غلام اور لونڈی آزاد مرد و عورت سے شادی نہیں کرسکتے تھے اور نہ ہی اعلیٰ طبقات کے لوگ کم تر میں شادی کرسکتے تھے۔ اہل روم میں مجموعی طور شادی کا رجحان زیادہ نہیں تھا، جو شادی تو کرلیتے مگر بچوں کی فطری خواہش سے محروم ہوتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ رومی معاشرے کی آبادی کم ہونے لگی تو اس کے ازالے کے لیے بچوں کی پیدائش کا حکم ہوا اور ان پر انعام و اکرام کی نوازشیں بھی ہونے لگی یہاں تک کہ بچوں کے اخراجات کے لیے وظیفے بھی مقرر ہونے لگے۔ مگر رومی تہذیب میں یہ

کوشش بھی ناکام رہی کیونکہ اہل روم نے سماجی زندگی کو فطری تقاضوں کے برعکس گزارنا پسند کیا تھا۔ سماجی زندگی بنیادی طور پر فطری طریقوں سے آگے بڑھتی ہے اور اخلاقی طور پر بہترین طریقہ شادی بیاہ کا تصور ہے، اسی شادی بیاہ کو نسل بڑھانے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے اور بچوں کی تعلیم وتربیت کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے اور اسی سے سماج اخلاقی طور پر بھی ترقی کرتا ہے۔

رومی تہذیب میں جہاں تک تعدد ازدواج کا تصور ہے تو ایک سے زائد بیویوں کا تصور موجود ہے مگر پہلی بیوی کو قانونی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور ان کے بچوں کے قانونی حقوق بھی پورے کیے جاتے اور انہیں وراثت میں بھی وارث سمجھا جاتا۔ پہلے بیوی کے علاوہ جتنی بیویاں آپ چاہیں رکھ سکتے ہیں مگر ان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی اور نہ ہی ان کے بچوں کا کوئی قانونی حق ہوتا۔ شادی کرتے ہوئے یہ بات علی الاعلان کی جاتی ہے بلکہ اس شرط کو تسلیم بھی کیا جاتا ہے کہ کوئی بھی بیوی پہلی بیوی کے بعد اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے کوئی قانونی چارہ جوئی کا حق نہیں رکھے گی۔ اسلامی تہذیب ہی ان مسائل کا حل پیش کرتی ہے کہ آپ قانونی طور پر جتنی بیویاں رکھ سکتے ہیں۔ شرعی طور پر سب برابر کی حق دار ہیں اور ان کی اولاد و بچے بھی مساوی حقوق رکھتے ہیں اول یا مابعد ہونے کی حیثیت سے کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں۔ مرد کے ذمے تمام بیویوں کے سماجی اور معاشی حقوق پورے کرنے اور تمام اولاد کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ پروفیسر یلسین مظہر صدیقی "تاریخ تہذیب اسلامی" میں قبل از اسلام عربوں کی سماجی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "شادی بیاہ میں یہ افراط تھی کہ ایک مرد جتنی بیویاں چاہتا کر سکتا تھا اور بے شمار باندیاں بھی رکھ سکتا تھا۔ نکاح کے دو اور خراب پہلو بھی تھے جو زیادہ عام نہ تھے لیکن بہر حال موجود تھے وہ یہ کہ اپنی سوتیلی ماں سے باپ کے مرنے کے بعد شادی کر لینا اور بیک وقت دو یا زیادہ سگی بہنوں کو نکاح میں جمع کر لینا۔ اسی طرح بعض اور محرمات سے بھی شادی کرنے کا رواج تھا"۔[30]

اگر قبل از اسلام عربوں کی تہذیبی زندگی کا مطالعہ کریں تو سماجی اخلاقیات کا تصور ویسا ہے جیسے قدیم تہذیبوں میں ملتا ہے۔ ایک مرد لاتعداد شادیاں کر سکتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ بے شمار لونڈی اور باندیاں بھی رکھ سکتا تھا۔ سوتیلی ماں سے اور دو سگی بہنوں سے شادی کرنا کوئی معیوب کی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ان حالات میں اس بات کی ضرورت تھی کی ایک ایسی تہذیب ہو جو سماجی اخلاقیات کا اعلیٰ تصور پیش کرے جس سے سماج ترقی کرتا ہوا اخلاقی اقدار کو اختیار کر کے مہذب معاشروں کی بنیاد رکھے۔ اسلامی تہذیب میں یہ تمام تصورات موجود تھے جہاں پر اخلاقیات کی نہ صرف تعلیم دی گئی بلکہ نبی کریم ﷺ کا اسوہ بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس تہذیب میں عورتوں کی عزت وتوقیر کی تعلیم ملتی ہے، محرم رشتوں کا تصور ملتا ہے، طبقاتی تقسیم کا خاتمہ ہوتا ہے اور معاشرے کے تمام افراد کے لیے حقوق و فرائض کا

تصور ملتا ہے یہ انسانی زندگی سماجی طور پر ترقی کرتے ہوئے اخلاقیات کے اعلیٰ مقام پر نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر گستاولی بان "تمدن ہند" میں لکھتے ہیں:

> "برصغیر کے رگ ویدی عہد میں معاشرتی طور پر مکمل سماجی مساوات قائم تھی۔ عورتوں کو معاشرے میں قابل تعظیم درجہ حاصل تھا۔ وحدۃ الازواج کی روایت تھی اور لڑکیوں کو اپنے شوہروں کے انتخاب کی پوری آزادی حاصل تھی۔"[31]

دور شجاعت کی تہذیب (۱۵۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ ق م) میں قدیم آریائی معاشرہ میں عورت کو جو عزت و مرتبہ حاصل تھا اگرچہ اس میں تھوڑی کمی آگئی تھی تاہم پھر بھی وہ اس عہد میں سماج کا باوقار کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔ طلاق اور بچپن کی شادی کا رواج نہیں تھا۔ بیوہ کو دوسری شادی اور اونچے گھرانے کی لڑکیوں کو بعض اوقات سوئمبر کے ذریعہ اپنے خاوند کے انتخاب کا حق حاصل تھا۔[32]

اگر برصغیر کے معاشروں کی سماجی حالت کا جائزہ لیں تو یہ دیگر تہذیبوں سے زیادہ متمدن ملتے ہیں۔ یہاں پر وادی سندھ کی تہذیب، گندھارا اور ٹیکسلا تہذیب کے جو آثار ملتے ہیں اس سے اس خطے کی سماجی حالت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اگر برصغیر کے مختلف ادوار کا جائزہ لیں تو یہاں سماجی مساوات کا تصور ملتا ہے، عورتوں کی عزت و تکریم اور شادی میں پسند و ناپسند کا تصور موجود ہے۔ رگ ویدی دور میں سماجی اخلاقیات کا اعلیٰ تصور موجود تھا مگر دور شجاعت میں اس میں قدرے کمی واقع ہوئی مگر اس کے باوجود عورتوں کی برابر عزت و تکریم کی جاتی تھی اور انہیں شادی کا حق حاصل تھا جبکہ ہندی تہذیب طبقاتی تقسیم کا شکار رہی اور سماج اخلاقی طور پر زوال کا شکار ہوا۔

سماجی اخلاقی روایت

کوئی بھی سماج اس وقت تک ترقی نہیں کر تا جب تک اس سماج میں اخلاقیات اور اخلاقی اقدار کو اپنی سماجی زندگی کا حصہ نہ بنالیا جائے۔ اس لیے ہر دور کی ہر تہذیب میں سماجی اخلاقی روایات کا تصور ملتا، مگر یہ اک الگ بحث ہے کہ انسانی تہذیبوں میں سماجی روایات اخلاقی اقدار پر مبنی تھیں یا اخلاقی زوال پر مبنی تھیں۔ ان روایات کا تب پتہ چلتا ہے جب کسی بھی تہذیب اور انسانی معاشروں کے سماجی حالات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ذیل میں مختلف تہذیبوں میں سماجی اخلاقی روایات کا جائزہ لیتے ہیں۔

ا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت

سماجی لحاظ سے بچے بہت اہمیت رکھتے ہیں، کیونکہ بچے ہی سماجی ارتقاء کی اہم کڑی تصور ہوتے ہیں۔ گویا بچے ہی سماجی نظام میں معمار کی حیثیت بھی رکھتے ہیں جن کی اچھی تربیت سماج کو صحت بند بنا دیتی ہے اور ان کی بری عادات سے سماج تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اگر انسانی تہذیبوں کا مطالعہ کریں تو بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے تعلیمات بھی ملتی ہیں

اور سماجی روایات بھی موجود ہیں۔ پروفیسر ہولم اپنی کتاب تاریخ یونان قدیم میں اہل سپارٹا کی سماجی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک خاص سن کو پہنچ کر زہریوں کو بچوں کو تنبیہ کرنے کا اختیار ہو جاتا تھا اور بشرط ضرورت ان کی زد و کوب بھی کی جا سکتی تھی جس کی وجہ سے اسپارٹی بچے ہمیشہ مؤدب و مہذب رہتے تھے۔ لڑکیوں کی تعلیم بھی بالکل لڑکوں کی طرح ہوتی تھی لیکن ان کی تربیت گاہیں بالکل جداگانہ تھیں اور کبھی انہیں لڑکوں کی ورزش دیکھنے اور کبھی لڑکوں کو ان کی ورزش دیکھنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ انہی اسباب کی بنا پر اسپارٹی عورتیں اپنی قوت اور حسن میں جملہ ممالک یونان میں سب سے ممتاز سمجھی جاتی تھیں"۔[33]

جان ایس ہائی لینڈ اپنی کتاب مختصر تاریخ تمدن میں اہل روم کے حوالے سے لکھتا ہے:

"قدیم زمانے میں رومی خاندان میں نظم و ضبط پر بہت زور دیا جاتا تھا کیونکہ رومی جانتے تھے کہ کوئی قوم حکومت نہیں کر سکتی جب تک کہ اسے خود اطاعت کرنی نہ آئے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا کام زیادہ تر غلاموں پر چھوڑ دیا گیا۔ یہ غلام عموماً بد اخلاق اور آوارہ ہوتے تھے"[34]

پلوٹارک (Plutarch)[35] اسپارٹی سماج سے متعلق لکھتا ہے:

"لکرگس[36] بچوں کو والدین کی بجائے ریاست کی امانت سمجھتا تھا۔ بچوں کے سلسلہ میں بھی اسپارٹا کا رویہ انتہائی غیر انسانی تھا۔ ان کے یہاں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو سب سے پہلے اسے قبیلہ کے بزرگوں کے سامنے پیش کیا جاتا اگر بچہ صحت مند و توانا ہوتا تو یہ بزرگ اس کی پرورش اور تعلیمات کے سلسلہ میں ہدایات جاری کرتے اور اگر بچہ کمزور یا معذور ہوتا تو وہ اسے کوہ ٹیگٹس کے نزدیک گہرے غار میں پھنکوا دیتے کیونکہ اس کی زندگی سے ریاست اور عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اسی طرح اسپارٹا کی عورتیں نومولود بچوں کو پانی کی جگہ شراب سے نہلاتیں تاکہ اگر بچہ کمزور ہے تو اسی تجربہ کے دوران جاں بحق ہو جائے اور اگر توانا و صحت مند ہے تو بچ جائے"۔[37]

یونانی تہذیب میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دی جاتی مگر لڑکے اور لڑکیوں کے لیے تربیت کا کوئی الگ نظام موجود نہیں تھا۔ کچھ معاشروں میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا زیادہ تر کام غلاموں سے لیا جاتا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر غلام بد اخلاق ہوتے ہیں جس کا اثر ان بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی نمایاں ہوتا۔ بچوں کی اس تربیت کی وجہ سے بچوں کی اخلاقیات بھی متاثر ہوتی تھیں، جس کی وجہ سے وہ سماجی برائیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بچوں کی ان بری عادتوں کا اثر پھر مجموعی طور سماج پر بھی پڑتا ہے اس لیے سماجی اخلاقیات میں زوال شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ معاشروں میں بچوں کی

صحت کے حوالے بھی عجیب روایات موجود ہیں۔ کمزور بچوں کو صحت پر توجہ دینے کی بجائے ان کو معاشرے کے لیے ناسور تصور کیا جاتا تھا اور اس کے وجود کو ریاست اور معاشرے کے لیے معدوم تصور کرتے تھے۔ اس لیے کمزور بچوں کو سماجی زندگی کا حق ہو سکتا ہے یا نہیں اس حوالے سے کافی افسانوی زندگی کا تصور بھی ملتا ہے مثال کے طور پر شراب سے نہلانے کی روایات وغیرہ۔

یہ سماجی روایات بھی عقل سے بالاتر معلوم ہوتی ہیں کی صحت اور زندگی کا یہ تصور بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ اسلامی تہذیب میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ لڑکے اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ تربیت کے حوالے سے ہدایات موجود ہیں اور ان کی تربیت کی ذمہ داری بھی والدین پر عائید کی گئی۔ اگر بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی صحت پر خصوصی توجہ دی جائے اور ان کو اخلاقی اقدار کی تعلیم دی جائے تو سماج بھی اعلیٰ اخلاقی اقدار کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

۲۔ عورت کا مقام و مرتبہ

عورت کے تصور کے بغیر کوئی بھی سماج قائم نہیں رہ سکتا، اس لیے انسانی زندگی میں عورت کا وجود کسی نعمت مطہرہ سے کم نہیں سمجھا جاتا۔ جہاں تک سماجی روایات کا تعلق ہے تو اس میں عورت کی عزت و تکریم اس انداز میں نہیں کی جاتی جیسی ہونی چاہیے، انسانی تہذیبوں کا مطالعہ کرنے سے بھی مختلف سماجی روایات سامنے آتی ہیں۔ اسپارٹی تہذیب میں عورتوں کی سماجی روایات سے متعلق پروفیسر ہولم اپنی کتاب تاریخ یونان میں لکھتا ہے:

> "مساویانہ تعلیم و تربیت کی وجہ سے عورت اور مرد کا رتبہ دیگر یونانی ممالک کی بہ نسبت مساویانہ تھا اور یہاں عورت کا مملکت پر بہت بڑا اثر تھا جس کی وجہ سے بعض مرتبہ اسپارٹی حکومت کو حکومت تنوریہ یا لہنگا شاہی حکومت کہا جاتا تھا"[38]

اہل ایتھنز کے یہاں (جو ازمنہ قدیم کی تمام قوموں سے زیادہ مہذب اور شائستہ سمجھے جاتے تھے) بیوی محض ایک اثاثہ تھی جس کی خرید و فروخت کی جا سکتی تھی جو محض گھر بار چلانے اور بچے پیدا کرنے کے لیے ضروری تھی۔ ایتھنز کے شہریوں کو بے حد و حساب بیویوں کی اجازت تھی چنانچہ ڈیمو سیتھنز فخریہ بیان کرتا ہے کہ اس قوم میں عورتوں کے تین طبقے تھے جن میں سے دو طبقے نکاحی بیاہی اور نیم نکاحی بیاہی عورتیں مہیا کرتے تھے۔[39]

عورت کو ہر حال میں شوہر کی وفاداری کی تلقین اور دوسری صورت میں شدید سزا کی وعید سنائی جاتی تھی۔ منو شاستر میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے:

> "اگرچہ شوہر بد چلن اور اوصاف حمیدہ سے خالی ہو اور عیاش بھی ہو، تاہم زوجہ کو چاہیئے کہ دیوتا کی طرح اس کی پرستش کرے۔ جو زوجہ شوہر کے فرائض کو پورا نہ کرے وہ مرنے کے بعد رسوا

ہو گی اور گیڈر کے پیٹ میں جنم لے گی۔ اس گناہ کے پاداش میں وہ انواع واقسام کے امراض میں مبتلا ہو گی"۔[40]

اس بت پرستی کے ساتھ ساتھ جس چیز نے ہندوستان کو اخلاقی انحطاط میں مبتلا کیا وہ جنسی بحران تھا۔ شہوانی جذبات اور جنسی میلان کو ابھارنے والے عناصر مذہبی صورت میں جس قدر ہندوستان کی تہذیب میں ہیں غالباً کسی دوسری تہذیب میں نہیں۔ ہندوؤں کی اخلاقی گراوٹ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں دیویوں اور دیوتاؤں کے باہمی اختلاط کی حکایتیں مذہبی طور پر سنی اور سنائی جاتی تھیں۔

۳۔ پیشے اختیار کرنے کی قید

انسانی تہذیبوں میں معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے معاشرے کے افراد مختلف پیشے اختیار کرتے تھے، تاکہ سماج کی معاشی ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔ ابتدائی تمدنی زندگی میں بھی اس کا تصور ملتا ہے کہ سماج کے مختلف افراد مختلف پیشے اختیار کر لیتے جس سے باہمی اشیاء کا تبادلہ کر کے ایک دوسرے کی معاشی ضروریات کی تکمیل کرتے تھے۔ بعد کے مہذب معاشروں میں یہ مختلف پیشے مختلف ناموں سے مشہور ہوئے۔ جہاں تک انسانی تہذیبوں میں مختلف پیشوں کا تعلق ہے تو پروفیسر ہیوبارٹ اپنی کتاب سلطنتوں کا انجام میں اہل روم کی ریاستی تنظیم میں مزدوروں کی تنظیم سازی کے حوالے سے لکھتا ہے:

"اگر کوئی شخص کسی رکن ادارے کی بیٹی سے شادی کر لے تو اس پر لازم تھا کہ وہ اپنے خسر کے کام میں شریک ہو جائے (بعد میں اپنے ادارے سے باہر شادی کرنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی) اس طرح سلطنت ایک بڑا قید خانہ بن گئی جہاں تمام آدمی اپنے مزاج کے مطابق نہیں بلکہ جبراً کام کیا کرتے تھے"۔[41]

جان ایس ہائی لینڈ اپنی کتاب مختصر تاریخ تمدن میں اہل روم کی معاشی زندگی کے حوالے سے لکھتا ہے:

"رومی سلطنت میں لوگوں کو باپ دادا کے پیشے اختیار کرنے پر مجبور کر کے اور مختلف طبی میلانات اور مدارج زندگی میں ان پیشوں کی آزادانہ گردش کو روک کر سماج کو غیر متحرک اور لکیر کا فقیر بنا دینے کا میلان پیدا ہو گیا تھا"۔[42]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تہذیبوں میں کمزور طبقات کو اپنی مرضی سے کوئی بھی پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ جو اس کے باپ دادا کا پیشہ ہوتا تھا اس کو اختیار کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سماج اخلاقی طور پر اتنا پست تھا کہ کسی بھی شخص کو اپنی صلاحیتوں کے استعمال کا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ اسلامی تہذیب میں ہر شخص کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا مساوی موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے

جیسا چاہیے پیشہ اختیار کر لے اور اسلام نے سماج میں ہر فرد کے ساتھ مساوی حسن سلوک کی تعلیم دی ہے۔ اس کا اثر نہ صرف ہر فرد کی انفرادی زندگی پر ہوتا ہے بلکہ سماج بھی اخلاقی طور پر ترقی کرتا ہے۔

۴۔ نسلی خودکشی کا خاتمہ

جان ایس ہائی لینڈ اپنی کتاب مختصر تاریخ تمدن میں اہل روم کی معاشرتی حالت کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"نسلی خودکشی کے عمل کو روکنے کے قانونی ذرائع سے انتہائی جدوجہد کی گئی۔ صاحب اولاد لوگوں کے محصول معاف کر دیے گئے تمام ملازمتوں میں ترقی دینے کے لیے خاص طور پر ان ہی لوگوں کو منتخب کیا گیا۔ ترکہ پانے کے لیے انہیں خاص حقوق دیے گئے۔ شادیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے عام طور پر سختی سے قانون نافذ کیے گئے لیکن یہ سب اپنے مقصد میں ناکام رہے"۔[43]

۵۔ حسن پرستی کا تصور

یونانیوں کی یہ حسن پرستی غیر انسانی، ظالمانہ اور غیر اخلاقی تھی کیونکہ لکرگس کے قانون کے مطابق ناجائز بچے اگر خوبصورت اور متناسب ہوں تو وہ جائز اور قانونی سمجھے جائیں گے۔ لکرگس اسپارٹا کے سن رسیدہ مردوں کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ اپنی جوان بیٹیوں کو خوبصورت اور ایماندار مردوں سے متعارف کرائیں اور ان سے بچے حاصل کریں تاکہ خوبصورت اور اعلیٰ نسل کے بچے دستیاب ہو سکیں۔ اسی طرح اگر کوئی مرد کسی شادی شدہ خوبصورت عورت کے اچھے چال چلن اور خوبصورت بچے دیکھ کر عاشق ہو جائے تو اس کے لیے بھی جائز تھا کہ بے تکلف زن مذکور کو اس کے شوہر سے مانگ لے تاکہ اپنے لیے خوبصورت اور لائق بچے حاصل کر سکے۔[44]

مندروں کے محافظ و منتظم بداخلاقی کا سرچشمہ تھے اور بہت سی عبادت گاہیں اخلاقی جرائم کا مرکز تھیں۔ محلات و درباروں میں بے تکلف شراب کا دور چلتا اور سرمستی میں اخلاقی حدود کا خیال نہ کیا جاتا۔ اس تن پروری اور نفس پرستی کے بالکل متوازی نفس کشی، ریاضت، مجاز (یوگ و تپسیا) کا سلسلہ بھی جاری تھا جس میں حد درجہ غلو اور انتہا پسندی سے کام لیا جاتا۔

8۔ماج کی اخلاقی خرابیاں

یونانی اپنے دورِ عروج میں اخلاقی خرابیوں کا شکار تھے۔ مرد اخلاقی اعتبار سے آزاد تھے۔ ان سے پاکیزگی اور عصمت کی توقع نہیں کی جاتی تھی۔ طوائفوں سے تعلق رکھنا ان کے ہاں معیوب نہ تھا البتہ عورتوں سے عصمت و شرافت کی توقع کی جاتی تھی۔ وہ ایک مرد سے وابستہ رہتیں اور طوائف بننا قابل قبول تھا۔ اس دور میں عورتیں گھروں میں رہتی اور مخلوط مجالس میں شریک نہ ہوتیں۔ ان کے گھروں میں مردوں اور عورتوں کے الگ حصے ہوتے۔ یونانیوں کے ہاں پردے کا بھی رواج تھا۔ اس طور پر انہیں معاشرتی اعتبار سے بلند درجہ حاصل تھا۔ لیکن یونانیوں کے ہاں جب اخلاقی تنزل شروع

ہوا تو پھر ان میں زناکاری عام ہوئی۔ یہ وہ دور ہے جس میں طوائف کلچر کو خوب فروغ ہوا۔ رومی سماج کی اخلاقی خرابیوں کے حوالے سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

"رنڈی کا کوٹھا یونانی سوسائٹی کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ طبقوں تک ہر ایک کا مرکز و مرجع بنا ہوا تھا۔ فلاسفر، شعراء، مؤرخین، اہل ادب اور ماہرین فنون، غرض تمام سیارے اس آفتاب کے گرد گھومتے تھے۔ وہ نہ صرف علم و ادب کی محفلوں کی صدر نشین تھی، بلکہ بڑے بڑے سیاسی معاملات بھی اس کے حضور میں طے ہوتے تھے۔ قوم کی زندگی و موت کا فیصلہ جن مسائل کے ساتھ وابستہ تھا ان میں اس عورت کی رائے وقیع سمجھی جاتی تھی جس کی دو راتیں بھی کسی ایک شخص کے ساتھ وفاداری میں بسر نہ ہوتی تھیں"۔[45]

غیر متمدن انسان جنسی حسد کے ساتھ نہیں بلکہ ملکیت کے تصور کے ساتھ جیتا تھا۔ اسے یہ بات پریشان نہیں کرتی تھی کہ اس کے پاس آنے سے پہلے اس کی بیوی کے دوسروں کے ساتھ کس قسم کے تعلقات تھے یا اب وہ اس کے مہمان کے پاس سوئی ہوئی ہے وہ اس کا مالک تھا نہ کہ عاشق۔ اسے جو چیز پریشان کرتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اس کی مرضی کے بغیر یا اپنی مرضی سے کسی اور انسان کے پاس نہیں رہ سکتی تھی۔ بعض افریقی خاوند اجنبیوں کو کچھ رقم یا اشیاء کے بدلے اپنی بیویاں ادھار دے دیتے۔[46]

اسپارٹا کی نوجوان عورتوں کے برہنہ جلوس نکلا کرتے تھے جس میں وہ ناچتی اور ورزش کرتی تھیں اور مردوں کو تاکید تھی کہ وہ ان برہنہ جلوسوں کا نظارہ کریں تاکہ ان میں شادی کا شوق پیدا ہو۔ جو مرد زیادہ عرصہ شادی نہ کرتا اس کے حقوق شہریت ساقط ہو جاتے تھے۔ جان ایس ہائی لینڈ اپنی کتاب مختصر تاریخ تمدن میں اہل روم کی اخلاقی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اخلاقی تنزل کی سب سے خطرناک علامت یہ تھی کہ شادی ایک بے حقیقت اور تمسخر بنتی جا رہی تھی۔ معمولی سے معمولی بات پر طلاق دی جانے لگی۔ لوگوں کی بڑی اکثریت شادی کرتی ہی نہ تھی۔ نوزائدہ بچوں کو مار ڈالنا یا انہیں پھینک دینا بہت عام تھا"۔[47]

ہیوبارڈ اپنی کتاب سلطنتوں کا انجام میں لکھتا ہے:

"اولاد نہ ہونے کے فائدے اتنے کثیر تھے کہ سنیکار (ایک زبردست فلسفی اور مدبر) ایک ماں کو جس کا اکلوتا بیٹا مر گیا تھا یہ یاد دلا کر اسے تسلی دیتا ہے کہ اب اس کی اس سے بھی زیادہ قدر و منزلت ہوگی۔ جو شخص شادی کر لیتا اس کی عقل اور حواس پر شبہ کیا جاتا تھا"۔[48]

جان ایس ہائی لینڈ اپنی کتاب مختصر تاریخ تمدن میں اہل روم کی معاشرتی زندگی کا خلاصہ ان الفاظ میں لکھتا ہے:

"رومی سلطنت ایک بے تہذیب و تمدن کی ہیبت ناک تقدیر بن کر رہ گئی تھی۔ ایسا تمدن جو محض ظاہری شان و شوکت اور عیش و نشاط کی کھوکھلی نمائش تھی جس کے اندر بے اندازہ خود غرضی اور بداخلاقی چھپی ہوئی تھی"۔ [49]

غلاموں اور کمزوروں کے ساتھ یہاں بھی وہی کچھ ہوتا تھا جو دنیا کے دوسرے معاشروں میں ہوتا رہا۔ انسانیت کی عظمت و برتری کا احساس یہاں بھی مفقود نظر آتا ہے۔ غلام کی موجودگی شرف کی علامت تھی۔ کوئی شخص جتنے غلاموں کا مالک ہوتا اتنا ہی معزز و محترم شمار ہوتا۔ رومیوں کی طرح یہاں بھی معمولی جرائم پر غلام کی جان لے لینا ایک عام سی بات تھی۔ منوشاستر میں لکھا ہے:

"برہمن بلاعذر وقت ضرورت اپنے غلام شودر کا مال بہ جبر لے سکتا تھا کیونکہ غلام صاحب جائیداد نہیں ہو سکتا اس کی کل املاک مالک کا مال ہے"۔ [50]

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی "تاریخ تہذیب اسلامی" میں قبل از اسلام عربوں کی تہذیبی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سماجی اقدار عالیہ کے پہلو بہ پہلو بدو اور متمدن عربوں دونوں میں بہت سی سماجی اور اخلاقی خرابیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ دولت کی بہتات اور غربت و جہالت کی لعنت نے ان میں شراب عام کر دی تھی۔ دوسری برائی جوئے اور قمار بازی کی تھی اور اس کی بہت سی قسمیں تھیں جن میں عرب مبتلا تھے۔ یہاں تک کہ وہ بسا اوقات بیوی بچوں کو جوئے میں داؤ پر لگا دیتے تھے"۔ [51]

"دولت کی فراوانی اور خوف خدا کی کمی نے عربوں میں کمزور طبقات پر ظلم کرنے اور ان کا استحصال کرنے کی روایت بھی ڈال دی تھی۔ بیوہ یتیم، بے سہارا، اجنبی اور کمزور عام طور سے ان کے ظلم و ستم کا شکار ہو گئے تھے"۔ (52)

سید امیر علی لکھتے ہیں:

"بے حیائی کی یہ حالت تھی کہ سب سے نامور شاعر امراء القیس ایک قصیدہ میں اپنی پھوپھی زاد کے ساتھ اپنی بدکاری کا قصہ مزے لے لے کر بیان کرتا ہے اور یہ قصیدہ کعبہ پر آویزاں کیا جاتا ہے"۔ [53]

سماجی نظام کی یہ وہ اخلاقی خرابیاں تھیں جو مختلف انسانی تہذیبوں میں دیکھی جا سکتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں زندگی کا کیا تصور موجود تھا۔ انسانی تہذیبوں میں ان کی سماجی زندگی معاشرتی ناہمواریوں کا شکار تھی، سماجی زندگی طبقات میں منقسم تھی اور اخلاقی لحاظ سے مرد غالب سمجھا جاتا تھا۔ اسلام سے قبل کے تمام معاشروں میں عورت مغلوب و محکوم سمجھی جاتی تھی مرد اس کے ساتھ جیسا چاہتے سلوک کرتے تھے۔ حقیقت میں انسان کی سماجی زندگی میں

عورت کا وجود ایک الگ حیثیت اور پہچان رکھتا ہے، کیونکہ سماجی ارتقاء میں عورت کا غالب حصہ ہوتا ہے اور یہ اس کا فطری تصور بھی ہے۔ مجموعی طور پر انسانی تہذیبوں میں سماجی اخلاقیات کا کوئی اعلیٰ تصور نہیں ملتا، اس لیے ان اخلاقی خرابیوں نے انسانی تہذیبوں کے مختلف سماجوں سے فطری زندگی کا تصور چھین لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں اسلامی تہذیب میں اخلاقی اقدار کا تصور ملتا ہے اور سماجی اخلاقیات کا ایک جامع اور مربوط نظام بھی موجود ہے۔ انسانی زندگی کا فطری تصور بھی یہی ہے کہ جس مقصد کے لیے انسانی تخلیق ہوئی ہے اس کو ان مقاصد اور ان حدود و قیود میں گزارا جائے تو انسانی زندگی حسن اخلاق کا اعلیٰ نمونہ بھی پیش کرتی ہے۔

9۔ اسلامی تہذیب اور سماجی اخلاقیات

اگر انسانی تہذیبوں کا مطالعہ کریں تو روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نہیں تھی جو من حیث القوم صالح کہی جاسکے اور کوئی معاشرہ ایسا نہیں تھا جو اخلاق کی اعلیٰ اقدار کا حامل تصور کیا جاتا ہو۔ اس عالمگیر تاریکی کا نقشہ سورہ روم میں کھینچا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ[54]

"خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے تاکہ خدا اُن کو اُن کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے عجب نہیں کہ وہ باز آجائیں"

انسانی تہذیبوں میں اخلاقی بگاڑ کی یہ حالت دیکھ کر اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک ایسی تہذیب ہو جو تمام انسانوں کو سماجی شعور دے تاکہ وہ معاشرے میں عزت و تکریم کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ سماجی تعلقات کی ایسی نوعیت ہو کہ آپس میں پیار و محبت کے رشتے قائم ہوں، ان رشتوں میں دوام ہو اور ایسے جذبے شعوری طور پر پیدا ہوں جس سے ان کی سماجی زندگی میں اعلیٰ اخلاقی اقدار قائم ہوں۔ اخلاق کا تعلق انسانی کردار و اعمال کی پختگی سے ہے، جب یہ اعمال درست ہوں گے تب انسان کی سماجی زندگی میں بھی اخلاقی اقدار قائم ہو جائیں گی۔

جہاں تک اسلامی تہذیب میں اخلاق کا تعلق ہے تو اخلاق سے مراد کسی شخص کے کردار اور عادات کے ہیں۔ انسان کا کردار ہی اس کے لیے بھلائی یا برائی کا سبب بنتا ہے۔ اس سے مراد ایسا کردار بھی ہے، جس سے انسانی روح کی بالیدگی میں اس کا اثر نمایاں ہوتا ہے جس کے نتیجے میں انسان اچھے اعمال کی طرف راغب ہوتا ہے اور اخلاقی اقدار اور اخلاقی معیارات کی تنفیذ اس کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔ کردار کی پختگی میں ایسا نشو و ارتقاء ہوتا ہے جس کی بنیاد پر اچھے اور برے کی تمیز سے روشناس ہو کر صرف اچھائی کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ جہاں تک اخلاق اور اس کی اہمیت کا تعلق ہے تو نبی کریم ﷺ کے اخلاق کے بارے میں بھی وضاحت ملتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ [55]

"اور تمہارے اخلاق بہت اعلیٰ ہیں"۔

جب ہم نبی کریم ﷺ کے اسوہ کی بات کرتے ہیں تو آپ کی پوری زندگی ہمارے لیے کامل نمونہ ہے۔ یہ اعلیٰ نمونہ آپ ﷺ کے اوصاف حمیدہ، عادات مطہرہ اور کمالات جلیلہ کی وجہ سے ہے۔ حدیث میں اخلاق کی اہمیت یوں بیان کی گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا۔ [56]

"عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے بہترین لوگ وہی ہیں جو اپنے اخلاق میں دوسروں سے اچھے ہیں۔"

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلُ فِي الْمِيزَانِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ۔[57]

"ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن میزان میں کوئی چیز بھی اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی نہ ہو گی۔"

عنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ۔[58]

"حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بندہ مومن حسن اخلاق سے وہی درجہ حاصل کر لیتا ہے جو دن کے روزوں اور رات کی نمازوں سے حاصل ہوتا ہے"۔

اسی بات کی وضاحت ہمیں دیگر احادیث میں بھی ملتی ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

البر حسن الخق والاثم ماحاک فی صدرک وکرہت ان یطلع علیه الناس [59]

"نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو برے دل میں کھٹکے اور تو لوگوں کو اس پر باخبر ہونے کو ناپسند کرے"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاق سے ہی انسان کے کردار کی تطہیر ہوتی ہے اور یہ اخلاق انسان کے کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی شخصیت میں اخلاق اور اخلاقی اقدار کی حیثیت مسلمہ ہے۔ اسلامی تہذیب نے سیرت و کردار اور سماجی نظام کے لیے اعلیٰ اخلاقیات کا بھی تصور دیا۔ طبقاتی تقسیم کا خاتمہ کرتے ہوئے مساوات کا تصور دیا، عورتوں کو حقوق دیتے ہوئے ان سے حسن سلوک کی تعلیم دی۔ والدین کا مقام و مرتبہ متعین کرتے ہوئے ان کی عزت و تکریم اور حسن سلوک کا حکم دیا، بچوں کی تعلیم و تربیت کا جامع نظام دیا اور غلاموں کے حقوق بھی متعین کر کے انہیں سماج میں ایک خاص مقام دیا۔ اسلامی تہذیب نے معاشرے سے تمام سماجی برائیوں کا خاتمہ کر کے اخلاقی اقدار کو قائم

کیا۔ انسان کو زندگی گزارنے کا ایسا طریقہ بتا دیا جن پر عمل پیرا ہو کر نہ صرف زندگی کو اسلامی بنیادوں پر گزار سکتے ہیں بلکہ سماج کو بھی اعلیٰ اخلاقی اقدار پر قائم کیا جا سکتا ہے۔

خلاصہ بحث

انسانی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو انسانی تہذیبوں میں سماجی زندگی بہت اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ اسی سے سماج ارتقاء کرتا ہے۔ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ سماجی زندگی ایسی ہو کہ تمام انسان باہم مل جل کر مہذب زندگی بسر کر سکیں، اس لیے تہذیب بھی انسانی زندگی میں اولین حیثیت رکھتی ہے۔ اسی تہذیب سے انسان کا طرز معاشرت بھی منعکس ہوتا ہے اور قوموں کا سماجی عروج وزوال بھی اسی تہذیب و تمدن کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ سماجی عروج میں اقدار اور اخلاقیات کا عنصر سب سے اہم ہوتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سماجی زندگی کی حقیقی نوعیتوں اور رعنائیوں کا انسانی زندگی پر کس قدر غلبہ ہے۔

قدیم انسانی تہذیبوں (یونانی، رومی، ایرانی اور مصری) کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سماجی زندگی آزادانہ طرز پر مبنی تھی، اخلاقیات کا کوئی تصور نہ تھا، طاقتور کمزور پر غالب سمجھا جاتا تھا، حقوق و فرائض کا بھی کوئی تصور نہ تھا، مرد حاکم اور عورت محکوم سمجھی جاتی تھی۔ سماجی روایات طبقاتی تقسیم کا شکار تھیں، کمزور طبقوں کو اپنی مرضی سے جینے کی آزادی نہیں ہوتی تھی اور غلاموں کے ساتھ تو بدتر سلوک کا تصور ملتا ہے۔ لونڈیوں کو اپنی ملکیت تصور کیا جاتا تھا اور ان کے ساتھ جیسا چاہتے سلوک کرتے تھے۔ عورتوں کو جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، مرد جتنی چاہتا شادیاں کر سکتا تھا اور جب چاہتا ان کو چھوڑ سکتا تھا۔ کچھ معاشروں میں عورتوں کو بچے پیدا کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا بھی کوئی اعلیٰ نظام موجود نہیں تھا۔ بچوں کی تربیت کی زیادہ تر ذمہ داری غلاموں کے سپرد ہوتی تھی جو خود بد اخلاق ہوتے تھے، جس کا اثر بچوں پر بھی ہوتا تھا اور یہی بچے جب بڑے ہوتے تو سماج اخلاقی خرابیوں کا شکار ہو جاتا تھا۔

اسلامی تہذیب میں سماجی زندگی کے حوالے سے باقاعدہ اصول وضوابط دیئے گئے، سماجی زندگی میں معاشرے کے تمام افراد کو بطور انسان حقوق عطا کیے گئے اور سماجی اخلاقیات کا اعلیٰ تصور بھی سامنے آیا۔ انسانی تہذیب کی بنیاد پر اخلاقی اقدار قائم رہ سکتی ہیں، اور انسانی تہذیبوں میں اسلامی تہذیب وہ عملی طریقہ ہے جس سے شخصیت کی نشوونما ہوتی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام قدیم تہذیبوں کی معاشرتی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے اس میں سماجی اخلاقیات کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اسلام نے جس اخلاقیات کا تصور دیا ہے اس پر عمل کر کے سماجی زندگی کو کس قدر مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ جدید سماجی نظام میں نئے نئے رجحانات جنم لے رہے ہیں اور مغربی تہذیب کی رعنائیاں بھی مشرقی تہذیب اور اس کی سماجی زندگی کو متاثر کر رہی ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے اس دور میں اخلاقی اقدار ختم ہوتی جارہی ہیں اور ان کی جگہ قانونی اقدار لینے کی سعی کر رہی ہیں۔ اخلاق انسان کے سماج کا ایک لازم جزو ہے اس لیے اسلامی

تہذیب میں اخلاقیات پر اتنا زور دیا گیا ہے اور سماجی زندگی میں اخلاقیات کے حوالے مکمل تعلیم بھی ملتی ہے اور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا اسوہ بھی موجود ہے۔ آج اسلامی تہذیب کو حقیقی معنوں میں اجاگر کرنے کی ضرورت ہے تا کہ جدید تہذیبی اثرات سے نہ صرف خود کو بچایا جاسکے بلکہ سماجی زندگی کا حقیقی اور فطری تصور بھی دیا جاسکے۔ انسانی سماج میں میں اخلاقیات کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے سماجی اخلاقی اقدار کو بھی اجاگر کرنے کی ضرورت ہے تا کہ تمام افراد کی تربیت کرتے ہوئے سماج کو اخلاقی طور پر بھی مضبوط بنایا جاسکے۔

حواشی وحوالہ جات

1۔ سورۃ بنی اسرائیل:17/17

2۔ امام غزالی، احیاء علوم الدین، مترجم: محمد احسن صدیقی، دار الاشاعت کراچی، 1979ء، ۳/39

3۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، مترجم: خلیل احمد، اسلامی اکادمی، لاہور، 1977ء، ص254

4۔ حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا، اخلاق اور فلسفہ اخلاق، فاروقی پریس، دہلی، طبع دوم 1950ء، ص16

5۔ ایضاً، ص20

6۔ ایضاً، ص24

7۔ محمد مجیب، تاریخ تمدن ہند،، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی، ص14

8۔ جان ایس ہائی لینڈ، مختصر تاریخ تمدن، مترجم: سید مبارز الدین رفعت، انجمن ترقی اردو دہلی، طبع اول، 1994ء، ص27

9۔ یونان کے جس قدیم زمانے کو عہد کلاسک کہتے ہیں اس میں اور ایطالیہ کے دور ترقی میں شہر سے مراد ریاست ہوتی تھی مگر ہمیشہ سے یہ شہر یا ریاستیں موجود نہ تھیں کیونکہ عصر قدیم میں ایک وقت ایسا تھا کہ زمین ایسے گروہوں کے قبضے میں ہوتی تھی جو تمدن کی بالکل ابتدائی حالت میں ہوتے تھے، ان گروہوں کو یونانی زبان میں ایتھنی کہتے تھے۔ ان کے پاس شہر یا ریاست قائم کرنے کے لیے کوئی علاقہ نہ تھا۔ (ولیم اسکاٹ فرگسن، یونانی شہنشاہیت، مترجم: محمد عنایت اللہ، جامع عثمانیہ، حیدر آباد، دکن، 1994ء، ص6)۔ یونانی شہر چھوٹے چھوٹے مقامات تھے، ان میں سب سے بڑا اور مشہور ترین شہر ایتھنز تھا۔ ایتھنز ہلینی نسلوں یا قبیلوں میں سے ایک یعنی ایونی یونانیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ (جان ایس ہائی لینڈ، مختصر تاریخ تمدن، ص65)

10۔ ہولم، تاریخ یونان قدیم، مترجم: ہاروں خان شیروانی، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد، دکن، 1/247

11۔ امیر علی، روح اسلام، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور 1992ء، ص260

12۔ آرتھر کرسٹن سین، ایران بعہد ساسانیاں، مترجم: ڈاکٹر محمد اقبال، انجمن ترقی اردو، دہلی 1941ء، 427

13۔ سورۃ الحجرات، 13/49

14۔ اس حوالے سے قرآن کریم کی بہت سی آیات اور احادیث مبارکہ میں تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَاۗءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاۗءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا۔ (سورۃ النساء:4/1) "اے انسانو! اپنے پروردگار (کی نافرمانی کے

نتائج) سے ڈرو۔ وہ پروردگار جس نے تمہیں اکیلی جان سے پیدا کیا(یعنی باپ سے پیدا کیا)اور اسی سے اس کا جوڑا بھی پیدا کیا(یعنی جس طرح مرد کی نسل سے لڑکا پیدا ہوتا ہے، لڑکی بھی پیدا ہوتی ہے)پھر ان دونوں کی نسل سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد دنیا میں پھیلادی(اور رشتوں اور قرابتوں کا بہت بڑا دائرہ ظہور میں آگیا)۔ پس دیکھو جس کے نام پر ایک دوسرے سے(مہر والفت کا)سوال کرتے ہو۔ قرابت داری کے معاملہ میں بے پرواہ نہ ہو جاو۔ یقین رکھو کہ اللہ تم پر(تمہارے اعمال کا)نگہبان ہے۔" نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا:یا ایھا الناس ان ربکم واحد و اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا اسود علی احمر ولا احمر علی اسود الا بالتقوىٰ۔(امام بیہقی، شعب الایمان، حدیث نمبر4760)"اے لوگو!تم سب کا خدا ایک ہے تم سب ایک ہی باپ کی اولاد ہو سنو کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کسی سیاہ کو سرخ پر کسی سرخ کو سیاہ پر کوئی فوقیت نہیں(نسل و رنگت کے سب امتیازات ہیچ ہیں)فضیلت کا دارومدار صرف تقویٰ اور خوف خدا پر ہے"۔

15۔ جبلتیں ایسے فطری یا موروثی میلانات ہیں جو تمام فکر و عمل کے مبتدا اور محرک ہوتی ہیں، خواہ یہ انفرادی ہوں یا اجتماعی ہوں۔ یہ ایسی بنیادیں ہیں جن پر افراد اور قوم کا کردار تدریجی طور پر تعمیر ہوتا ہے۔(کمنڈ انلڈ، سماجی نفسیات، ص19)

16۔ جان ایس ہائی لینڈ، مختصر تاریخ تمدن، ص27

17۔ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقاء، مترجم: تنویر جہاں، فکشن ہاؤس، لاہور، 1993ء، ص85

18۔ایضاً، ص88

19۔ایضاً، ص82

20۔ایضاً، ص86

21۔سورۃ الرعد:13/38

22۔النور:34/32

23۔ ہولم، تاریخ یونان قدیم، 1/244

24۔ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقاء، ص84

25۔ ہولم، تاریخ یونان قدیم، 1/218

26۔ تسنویس، تاریخ ملل قدیمہ، مترجم: سید محمود اعظم فہمی، مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ، 1921ء، ص153، 154

27۔ جان ایس ہائی لینڈ، مختصر تاریخ تمدن، ص104

28۔امیر علی، روح اسلام، ص224

29۔امیر علی، روح اسلام، ص224

30۔ یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر، تاریخ تہذیب اسلامی(عہد جاہلہ وعہد نبوی)، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز، نئی دہلی، 2012، 1/58

31۔ گستاؤلی بان، تمدن ہند، مترجم: سید علی بلگرامی، مقبول اکیڈمی، لاہور، ص245

32۔ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقاء، ص84

33۔ ہولم، تاریخ یونان قدیم، 1/243

34۔ جان ایس ہائی لینڈ، مختصر تاریخ تمدن، ص94

35۔ پلوٹارک کلاڈیٹس کے عہد حکومت میں بیوشا میں تھئینز کے قریب کے قریب کیرونیا میں 46ق م کو پیدا ہوا اور 120ق م میں وفات پائی۔ پلوٹارک یونی سوانح نگار اور مؤرخ تھا۔ فلسفہ میں کمال مہارت رکھتا تھا۔ اس نے ڈومیشان کے دور میں اخلاقیات پر خطبات دیئے، جس کی وجہ سے اس کے کچھ مداح بن گئی مگر اصل شہرت سوانحی تحریروں سے ملی۔

36۔ لکرگس، اسپارٹا کا مشہور قانون دان تھا۔ تاہم اس کے حالات زیادہ معلوم نہیں۔ پلوٹارک نے اس کے قوانین وخیالات پر مبنی پورا باب "مشاہیر یونان وروما" میں لکھا ہے۔

37۔ پلوٹارک، مشاہیر یونان روما، مترجم: سید ہاشمی، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، 1919ء، 1/113، 114

38۔ ہولم، تاریخ یونان قدیم، 1/244

39۔ امیر علی، روح اسلام، ص223

40۔ منوشاستر، باب پنجم: 54-164

41۔ ہیوبارٹ، سلطنتوں کا انجام،، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن، 1974ء ص129

42۔ جان ایس ہائی لینڈ، مختصر تاریخ تمدن،، ص102

43۔ ایضاً، ص103

44۔ پلوٹارک، مشاہیر یونان روما، مترجم: سید ہاشمی، ص113

45۔ مودودی، ابو الاعلیٰ سید، پردہ، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 2003، ص14

46۔ ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقاء، ص86

47۔ جان ایس ہائی لینڈ، مختصر تاریخ تمدن، ص103

48۔ ہیوبارٹ، سلطنتوں کا انجام، ص141

49۔ جان ایس ہائی لینڈ، مختصر تاریخ تمدن، ص104

50۔ منوشاستر، باب ہشتم، 417

51۔ یسین مظہر صدیقی، پروفیسر، تاریخ تہذیب اسلامی (عہد جاہلہ وعہد نبوی)، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز، نئی دہلی، 2016، 1/57

52۔ ایضاً، ا/58

53۔ امیر علی، روح اسلام، ص228

54۔ سورۃ الروم: 30/41

55۔ سورۃ القلم: 68/4

56۔ امام بخاری، الجامع الصحیح، کتاب المناقب، باب صفۃ النبی ﷺ، حدیث نمبر 3559

57۔ امام ابو داؤد، سنن ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی حسن الخلق، حدیث نمبر 4799

58۔ امام ابو داؤد، سنن ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی حسن الخلق، حدیث نمبر 4798

59۔ امام مسلم، الجامع الصحیح، باب تفسیر البر والاثم، حدیث نمبر 2553